پاکستان کی اصل اساس

عالمی سطح پر بھی عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے، (بلکہ اس ضمن میں بالکل غلط طور پر اسرائیل کا نام بھی پاکستان کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے) اور اندرون ملک بھی یہ بات اتنے زور شور، اِس قدر شد و مد اور اِس درجہ تکرار و اعادہ کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اب عام طور پر تو اس جانب دھیان ہی نہیں دیا جاتا اور بہت سے لوگوں کو اس سے متلی کی سی کیفیت (Nausea) کا اِحساس ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ منبر و محراب سے تو یہ صدا تقریباً مسلسل ہی بلند ہوتی رہی ہے اور سیاست کے میدان کے بھی نیم سیاسی اور نیم مذہبی کھلاڑیوں نے اکثر و بیشتر اُسی ''نعرے'' کا سہارا لیا ہے۔ لیکن گزشتہ آٹھ برسوں کے دَوران خود ایوانِ حکومت سے یہ راگ جس تسلسل اور بلند آوازی کے ساتھ لایا گیا ہے اُس نے غالباً سب کو مات دے دی ہے! ——— (اگرچہ اکثر سیاسی مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اب یہ نعرہ اپنی معنویت اور تاثیر کھو چکا ہے)۔

دوسری جانب گاہے گاہے کچھ دوسری باتیں بھی سننے میں آتی رہتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کے اصل اسباب خالص سیاسی تھے یا خالص معاشی!

جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہے اس بات کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہنے والی پہلی سیاسی شخصیت جناب حسین شہید سہروردی کی تھی، جنہوں نے اِس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خالص معاشی اسباب کی بناء پر قائم ہوا ہے۔ تاہم اُن کی بات کو زیادہ اہمیت اس لیے نہیں دی گئی تھی کہ وہ بذاتِ خود ایک متنازعہ شخصیت تھے اور قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً بعد ہی انہوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر اپنی علیحدہ سیاسی جماعت قائم کر لی تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد جناب نور الامین نے بھی ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں شائع شدہ ایک طویل انٹرویو میں اِسی رائے کا اظہار کیا تو اِس کا وزن محسوس کیا گیا اور سوچنے سمجھنے والوں نے کم از کم یہ ضرور محسوس کیا کہ بات غور و فکر کے قابل ہے۔

ان دونوں حضرات کی ع ''متفرق گردید رائے بوعلی بارائے من!''
کے مصداق متفق علیہ بات اِس لیے بھی اہمیت اختیار کر گئی کہ ان دونوں کا تعلق متحدہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے سے تھا، مزید برآں اُسی کے صدر مقام ڈھاکہ کو مسلم لیگ کے ''مولد'' (جائے ولادت) کی حیثیت حاصل تھی اور وہیں مسلم لیگ نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی نشو و نما پائی تھی، بلکہ طویل عرصے تک حکومت بھی کی تھی۔ مزید برآں یہ صوبہ وہ تھا جو تقسیم ہند سے بہت قبل ایک بار صوبائی تقسیم کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ الغرض اُن دونوں حضرات کی بات ہرگز ایسی نہ تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی۔ چنانچہ پاکستان کی نئی نسل نے بلا شبہ اِن حضرات کی بات کا اثر قبول کیا۔

یہ دونوں بزرگ تو عرصہ ہوا اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ دو تین برسوں کے دَوران دو اور بزرگ شخصیتوں کی جانب سے بھی اِس سے ملتی جلتی رائے سامنے آئی ہے۔ اگرچہ اِس بار جو لفظ استعمال ہوا وہ ''معاشی'' نہیں ''سیاسی'' ہے۔ چنانچہ پہلے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تحریک پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ خالص سیاسی تحریک تھی، اور جب اُن پر لے دے ہوئی تو انہوں نے جو وضاحتیں اور معذرتیں پیش کیں وہ بالکل ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق تھیں۔ نتیجتاً جس قدر وہ وضاحتیں پیش کرتے گئے اتنے ہی دلدل میں مزید پھنستے چلے گئے۔ بعد ازاں جناب سردار شوکت حیات خان صاحب سامنے آئے اور انہوں نے یہ فرما کر کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ! ہرگز کوئی سنجیدہ اور سوچی سمجھی بات نہیں تھی، بلکہ یہ نعرہ تو چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا!'' گویا بات ہی ختم کر دی۔

کسی کو ان دونوں حضرات کی رائے خواہ کتنی ہی غلط نظر آئے، اِس حقیقت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تحریک پاکستان کے کارکنوں اور قائد اعظم کے نوجوان ساتھیوں میں شامل تھے، اور فی الوقت دونوں ہی کا شمار موجودہ بچے کھچے پاکستان کے بزرگ ترین سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ مزید برآں دونوں کا تعلق اُس

صوبے سے ہے جو موجودہ پاکستان میں ہر اعتبار سے عظیم ترین ہے۔

اِس صورتِ حال کا خوفناک ترین نتیجہ یہ نکلا کہ ؏

''شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!''

کے مصداق پاکستان کی نئی نسل شدید ذہنی وفکری انتشار (Confusion) کا شکار ہے اور اُسے نہ اپنے تشخص کا شعور حاصل ہوسکا ہے نہ کسی مقصد یا منزل ہی کا سراغ مل سکا ہے، اور اس کی حالت کم وبیش اُس مسافر کی سی ہے جو گھر سے تو کسی معین کام کے لیے کسی شہر کے سفر کے لیے چل پڑا ہو، لیکن اثنائے سفر میں کسی حادثے کے باعث اُس کی یادداشت زائل ہو جائے اور اب اُسے نہ یہ یاد رہے کہ میرا گھر کہاں ہے اور میں نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا؟ اور نہ یہ یاد رہے کہ میں جا کہاں رہا ہوں اور وہاں مجھے کام کیا کرنا ہے؟

لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پوری سنجیدگی اور زیادہ سے زیادہ حقیقت ووا قعیت پسندانہ (Realistic) اور ممکنہ حد تک معروضانہ (Objective) انداز میں غور کیا جائے کہ قیامِ پاکستان کا اصل سبب کیا تھا؟ تحریکِ پاکستان کے اصل محرکات کیا تھے؟ اور وطنِ عزیز کی کوئی حقیقی اور واقعی جڑ بنیاد ہے بھی یا نہیں؟

اور اس جائزے اور تجزیے کے دوران ضرورت ہوگی کہ نہ حقائق کو مسخ کیا جائے، نہ کسی ''آرزومندانہ اندازِ فکر'' (Wishful Thinking) کو دخل انداز ہونے کا موقع دیا جائے، نہ کسی شخصیت کی عظمت اور محبت وعقیدت کو حائل ہونے دیا جائے اور نہ کسی کی ناراضگی یا رضامندی کا لحاظ کیا جائے، بلکہ اصل حقائق کو جرأت وہمت کے ساتھ خود بھی قبول کیا جائے اور پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ اُن کا ڈنکے کی چوٹ اظہار و اعلان بھی کیا جائے۔

اس نہایت پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلے کے حل کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ پہلے اِس کی تین جداگانہ سطحوں (Levels) کا شعور حاصل کر لیا جائے اور پھر ہر سطح پر حقیقت کے جزوی ادراک کے بعد حقیقتِ کلی کی جانب پیش قدمی کی جائے۔

اس مسئلے کی تین جداگانہ سطحوں کے لیے بہترین تمثیل زمین پر پانی کی تین مختلف سطحوں کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ایک پانی وہ ہے جو سطحِ زمین پر دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ظاہر و باہر پانی جو ہر انسان کو بچشم سر نظر آتا ہے یہی ہے۔ پانی کی دوسری سطح وہ ہے جہاں سے اُسے کنوؤں اور ہینڈ پمپوں وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہے اور اس کے سوتے کہیں تیس چالیس فٹ گہرائی پر چل رہے ہوتے ہیں، کہیں ستر اسی فٹ گہرائی پر اور کہیں اس سے بھی نیچے، اور از منہ قدیم سے ماضی قریب تک دریاؤں اور ندیوں سے بعد اور فاصلے پر انہی زیرِ زمین سوتوں کا پانی بقائے حیات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ جب کہ پانی کی تیسری سطح وہ ہے جو سطحِ زمین سے کئی سو فٹ نیچے ہے اور جہاں سے زمانۂ حال میں پینے کے لیے صاف وشفاف پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اِسی طرح پاکستان کی ''ایجاد'' یا ''تکوین'' (Genesis) کے اسباب یا محرکات کو بھی بالکل تین علیحدہ سطحوں (Levels) پر سمجھا جاسکتا ہے:

اِس کی پہلی اور نمایاں ترین سطح یہ ہے کہ ''پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا'' چنانچہ یہ ''ظاہر و باہر'' حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، بجز اس کے کہ کوئی سخت ڈھٹائی ہی پر اُتر آئے اور حقیقت واقعی کے انکار پر کمر کس لے۔ اس کی حیثیت اُس نوشتۂ دیوار (Writing On The Wall) کی ہے، جو ہر شخص کے سامنے رہتی ہو اور جس سے صرفِ نظر ممکن نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات پوری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے، قطع نظر اس سے کہ کسی کو پسند ہو یا نہ پسند!

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کو از درۂ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چٹا گانگ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا نعرہ بہرصورت ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!'' ہی تھا اور اس سے ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اس کے الفاظ بزرگوں نے متعین کیے تھے یا نوجوانوں نے ترتیب دے لیے تھے۔

پھر بات صرف ایک نعرے کی نہیں ہے بلکہ اُن واضح و غیر مبہم اور واشگاف وبرملا بیانات و اعلانات کی ہے، جن کے ذریعے پاکستان کے بانی و موسس اور تحریک

پاکستان کے ''قائداعظم'' نے مسلمانوں کی قومیت کی اساس ''مذہب'' کو، پاکستان کی منزل ''اسلام'' کو اور پاکستان کا دستور ''قرآن'' کو قرار دیا تھا اور قیامِ پاکستان کا مقصد یہ بیان کیا تھا کہ ہم پاکستان کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے اُصولِ حریت، مساوات اور اخوت کی جدید تفسیر اور عملی نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اِس حقیقت سے انکار کوئی نہایت ڈھیٹ شخص ہی کر سکتا ہے کہ ان اعلانات کے بغیر نہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن سکتی تھی، نہ برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں بسنے والے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے تھے۔ یہ حقیقت اتنی ظاہر و باہر اور سطحِ زمین پر بہنے والے دریاؤں اور ندیوں کے پانی کے مانند اتنی عیاں ہے کہ اس پر قلم و قرطاس کا مزید صرف تحصیلِ حاصل کے ذیل میں آئے گا۔

تو اب آیئے دوسری سطح کی جانب جس کا صحیح تعین ایک سوال کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ''تحریکِ پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ کیا تھا؟'' ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ یہ سوال نہایت گہرا ہے اور اس کا جواب دینا آسان کام نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اِس سوال کے جواب میں پوری دیانت اور خلوص و اخلاص کے باوجود اختلاف کی بڑی گنجائش موجود ہے۔

ان سطور کے عاجز و حقیر راقم کے نزدیک اِس سوال کا ایک منفی جواب تو بادنیٰ تامل سامنے آ سکتا ہے اور اس پر اتفاق (Consensus) بھی زیادہ مشکل نہیں ہے، البتہ تحریکِ پاکستان کے اصل محرک کی مثبت تعیین واقعتاً آسان نہیں۔

شاید بہت سے قارئین اِس پر چونک جائیں اور حیران ہوں کہ راقم بھی اُن لوگوں کی رائے کو درست سمجھتا ہے جن کے نزدیک تحریکِ پاکستان کا اصل عامل اور جذبۂ محرکہ ''مذہبی'' نہیں کچھ اور تھا۔ اِس ''کچھ اور'' پر تو گفتگو بعد میں ہوگی سرِدست راقم اپنے آپ کو اس دیانتدارانہ رائے کے اظہار پر مجبور پاتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ مذہبی نہیں تھا، اور اُس کے نزدیک اس کا بالکل بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصلی قیادت علیاہرگز ''مذہبی لوگوں'' پر مشتمل نہیں تھی اور اِس قاعدہ کلیہ سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی تحریک کا اصل جذبہ محرکہ سب سے زیادہ نمایاں اور ''گاڑھی'' صورت میں اُس کی قیادت میں نظر آنا لازم ہے۔

یہ حقیقت اگرچہ کسی قدر تلخ ہے اور اس کا اظہار غالباً بہت سے لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوگا لیکن ہمیں اپنی قومی زندگی کے چالیسویں برس میں تو اتنا ''بالغ'' ہو جانا چاہئے کہ تلخ حقائق کا اعتراف ہی نہیں اعلان بھی کر سکیں۔

اس مرحلہ پر یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ شرافت و مروت اور صداقت و دیانت جداگانہ حقیقتیں ہیں اور ''مذہبیت'' ایک جداگانہ حقیقت ہے۔ اِس کی نمایاں ترین مثال، ابوطالب سے قطع نظر کہ اُن کا معاملہ اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین مختلف فیہ ہے، مطعم بن عدی کی ہے جس نے سفرِ طائف سے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر اپنی امان کے اعلان اور اپنے چھ بیٹوں سمیت ہتھیار بند ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بحفاظت مکہ میں داخلے کا اہتمام کیا تھا۔ اگرچہ وہ خود آخری وقت تک ایمان نہیں لایا اور اُس کی موت کفر و شرک ہی پر واقع ہوئی۔

اِسی طرح یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اس وقت ہم ایک عوامی تحریک کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زیرِ بحث ''مذہبیت'' کا بھی وہ معیار اور تصور قابلِ لحاظ ہوگا جو عام مسلمانوں میں معروف و مشہور ہو، نہ کہ کسی خاص دانشور کا اپنے ذہن و فکر سے تراشیدہ اور خود اختیار کردہ معیار و تصور۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالباً کوئی ایک شخص بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ نہ صرف یہ کہ اس وقت عوامی سطح پر مروجہ تصورات کے مطابق ''مذہبی'' لوگ نہ تھے بلکہ اُن کی اکثریت جدید دَور کی مروجہ اصطلاح کے مطابق (Practising Muslims) پر بھی مشتمل نہ تھی۔

اِس ضمن میں ایک فیصلہ کن مثال تو اُس واقعے کی صورت میں سامنے آتی ہے جو راقم کو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے سنایا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں مسلم

لیگ کی ہائی کمانڈ کا جو اجلاس سکھوں کے ساتھ گفت و شنید کے اُصول طے کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں مسلم لیگ کے ۲۳؍اعلیٰ ترین قائدین شریک تھے، (چشتی صاحب نے بہت سے حضرات کے نام بھی تعین کے ساتھ لیے تھے جو میری نوٹ بک میں درج ہیں لیکن اِس وقت اُن کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا!) اُس میں جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو نماز کے لیے جو لوگ اُٹھے وہ کل دو تھے: ایک بیگم مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور جو برقع پوشی کی حالت میں شریک اجلاس تھیں اور دوسرے خود پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ نواب سر شاہنواز ممدوٹ کی علالت کے باعث اُن کے نمائندے کی حیثیت سے شریک اجلاس تھے۔ میں چشتی صاحب کی اس روایت کو قبول کرنے میں شاید کچھ تامل کرتا۔ لیکن جب مجھے یاد آیا کہ بالکل یہی کیفیت ۲۲؍فروری ۱۹۷۴ء کے دن لاہور میں منعقد ہونے والی ''عالمی سربراہی کانفرنس'' کے موقع پر پیش آئی کہ مغرب کی نماز کے وقت بھی اجلاس ایسے جاری رہا تھا جیسے کسی کو احساس ہی نہ ہو کہ کون سا وقت آیا اور گزر گیا۔ (اُس وقت غالباً واحد مستثنیٰ ذات شاہ فیصل شہید کی تھی جو مغرب کی نماز ادا کر کے تاخیر ہی سے اجلاس میں شریک ہوئے تھے) تو اِس واقعے کی صحت تسلیم کرنے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔

دوسری نہایت پیاری بات وہ ہے جو پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کی جاتی ہے کہ اُن پر کسی نے اعتراض کیا کہ ''آپ اتنی عظیم دینی و روحانی شخصیت کے حامل بلکہ لاکھوں کے دینی و روحانی مقتدا و رہنما ہو کر ایک داڑھی منڈے شخص (مراد تھے قائداعظم مرحوم!) کے پیچھے کیسے لگ گئے اور آپ نے کیسے اُسے اپنا رہنما تسلیم کر لیا؟'' تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ''بھائی! میں نے محمد علی جناح کو اپنا دینی یا روحانی پیشوا نہیں مانا، بلکہ صرف اپنے قومی مقدمے کے لیے ایک قابل و ماہر اور شریف و دیانتدار وکیل کے طور پر قبول کیا ہے!'' اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قائداعظم یقیناً ایک نہایت قابل و ماہر وکیل بھی تھے اور اُن کی دیانت اور امانت پر بھی کوئی حرف اُن کا بدترین دشمن بھی نہیں رکھ سکا۔ اِس کے باوجود نہ وہ واقعتہً ''مذہبی'' انسان تھے، نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو تکلفاً یا تصنعاً اِس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

رہے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تو خواہ وہ اپنے اپنے مقام پر کسی بھی مرتبے اور حیثیت کے مالک رہے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی قیادت کے ضمن میں اُن کا مقام اوّلین صف میں نہیں بلکہ ثانوی درجے میں تھا۔ اور اُن کی اصل حیثیت ''قائدین'' کی نہیں بلکہ ''معاونین'' کی تھی۔

بہرحال زیر بحث سوال کے اس منفی جواب کے بعد آیئے کہ اِس کا مثبت جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک اِس ضمن میں پوری حقیقت کی جامع تعبیر نہ ''معاشی'' کے لفظ سے ہوسکتی ہے نہ ''سیاسی'' سے، بلکہ اس کی صحیح اور جامع تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ وہی ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ کے محولہ بالا قول میں استعمال ہوا ہے یعنی 'قومی'!

تحریک پاکستان اصلاً ایک قومی تحریک تھی اور اُس کا اصل جذبہ محرکہ ایک ''چھوٹی قوم کا یہ ''خوف'' اور ''خدشہ'' تھا کہ اُس سے کئی گنا زیادہ بڑی قوم اُس کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ نہیں کرے گی، بلکہ سیاسی اعتبار سے اُسے ''محکوم'' بنانے کی کوشش کرے گی، معاشی سطح پر اُس کا استحصال کرے گی اور سماجی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اُس کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور اس پر بس نہیں کرے گی بلکہ ہر ممکنہ ذریعے سے اپنی گزشتہ محکومی کا بدلہ لینے اور حساب چکانے کی کوشش کرے گی یعنی اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے گی۔ اور چونکہ یہ ''خوف'' اور اندیشہ'' نہ فرضی تھا نہ خیالی و وہمی بلکہ حقیقی اور واقعی تھا، جس کا ادراک و احساس مسلمانانِ ہند کے ہر طبقے اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہو رہا تھا لہٰذا اِس تحریک نے جنگل کی آگ کی طرح وسعت اختیار کر لی اور اپنے جداگانہ تشخص کی ضمانت اور اپنے سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت کے لیے برصغیر کی پوری مسلمان قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی، اور اس نعرے سے برصغیر کا طول و عرض گونج اٹھا کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!''

گویا تحریک پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ نہ مذہبی تھا، نہ محدود معنی میں معاشی یا سیاسی بلکہ وہ ایک قومی جذبہ تھا جس نے جملہ تہذیبی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی محرکات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

مسئلہ زیر بحث کی تیسری اور سب سے گہری سطح کا تعین اِس سوال کی صورت میں ہوتا ہے کہ ''اُس چھوٹی قوم کی قومیت کی بنیاد کیا تھی؟'' جس کے جواب میں ہم لامحالہ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے، اس لیے کہ یہاں پھر ایک ناقابل تردید حقیقت کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمان نہ کسی نسل کی بنیاد پر ایک قوم تھے، نہ زبان کی بنیاد پر، پھر نہ اُن کا لباس ایک تھا، نہ اکل وشرب کے ذوق اور طور طریقے ایک تھے، بلکہ اُن کو ایک قوم بنانے والی کوئی قدر مشترک تھی تو صرف ایک یعنی مذہب! یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تحریک مسلم لیگ اصلاً ایک مذہبی تحریک نہ تھی، نہ ہی اس کی اصل قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی، لیکن اُسے مسلمانانِ ہند میں ایک قومی وحدت کے شعور کو بیدار اور اُجاگر کرنے کے لیے سب سے زیادہ انحصار مذہبی جذبے پر کرنا پڑا اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے ع

''بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر!''

کے مصداق مذہبی نعرہ لگانا پڑا یعنی: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ''۔

ہمیں اس بحث میں جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اِس نعرے میں وہ قیادت مخلص تھی یا غیر مخلص، اس لیے بھی کہ نیتوں کا حال صرف اللہ کے علم میں ہے اور ہمیں لوگوں کی نیتوں کو زیر بحث لائے بغیر ساری گفتگو حقائق و واقعات ہی کے حوالے سے کرنی چاہیے، اور اس لیے بھی کہ کسی عوامی تحریک کے ضمن میں اصل فیصلہ کسی خاص یا چند اشخاص کے خیالات ونظریات کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اِس اساس پر ہوتا ہے کہ اُس میں عوام نے شمولیت کس بناء پر اور کس تصور کے تحت کی۔

بنابریں، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کی اصل اساس سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں ہے، اور پاکستان کی واحد جڑ بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے۔ اور جس طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب اُن سے نام دریافت کیا جاتا تو اوّلاً صرف ایک لفظی جواب دیتے ''سلمان!'' اور اگر عرب کی روایت کے مطابق مزید پوچھا جاتا تھا کہ ''سلمان ابن؟''......تو جواباً ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''سلمان ابن اسلام'' یعنی میری ولدیت اسلام ہے۔ اسی طرح پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی ولدیت اسلام ہے۔

استحکام پاکستان کی ٹھوس بنیاد

تحریک پاکستان کے محرکات وعوامل، قیام پاکستان کے اسباب و وجوہات اور پاکستان کی اصل جڑ بنیاد کا مسئلہ فی نفسہٖ نہایت اہم ہے اور پاکستان کے کل زوال و اضمحلال اور انتشار فکر وعمل کا اصل سبب یہی ہے کہ قومی سطح پر یہ بنیادی مسئلہ ہی متنازعہ اور مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ تاہم چلیے، تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اصل اہمیت اس کی نہیں، اِس لیے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہو چکا ہے اور ہمیں ماضی کے معاملے کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالے کر کے اپنی ساری توجہات کو حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر پر مرکوز کر دینا چاہیے۔

اِس صورت میں بھی ہمارے غور وفکر کا اصل مرکز ومحور یہ سوال ہو گا کہ پاکستان کے استحکام کے لیے حقیقتاً اور واقعتاً ٹھوس بنیاد کون سی ہے جسے مضبوط کرنے سے پاکستان مستحکم ہو جائے اور اپنے وجود اور سالمیت کے خلاف جملہ داخلی اور خارجی حملوں کے مقابلے میں اپنا مؤثر دفاع کر سکے؟ یہ سوال ظاہر ہے کہ صرف دینی اور مذہبی نقطہ نگاہ ہی سے اہم نہیں ہے، بلکہ خالص مادی اور دنیوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔ اس لیے کہ

یہ ہمارا وطن ہے اور نہ صرف یہ کہ اس وقت ہم اس میں آباد ہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔ یہ باعزت ہے تو ہم بھی باعزت ہیں اور خدانخواستہ یہ ذلیل ہو جائے تو اصل ذلت ہماری ہوگی، یہ آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں، یہ غلام ہو گیا تو اصل غلام ہم ہوں گے، یہ خوشحال ہوگا تو ہم خوشحال ہوں گے اور اس پر تنگی آئی تو اُس تنگی کا شکار ہم ہوں گے۔ گویا یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیرتے ہیں اور یہ ڈوب گئی تو ہم غرق ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہر پاکستانی کے لیے لازم ہے کہ وہ پاکستان کے باعزت بقاء اور اس کے استحکام کے مسئلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرے۔

تو آیئے کہ سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ بالعموم ملکوں کو کن کن جہتوں سے تقویت ملتی ہے اور کن کن عوامل کی بناء پر استحکام حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے کون کون سے عوامل ہمیں پاکستان کے استحکام کے لیے دستیاب ہیں جنہیں مزید تقویت دے کر ہم پاکستان کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

1- تاریخی عامل

ان میں سے اوّلین عامل کو ’’تاریخی عامل‘‘ (Historical Factor) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی ملک عرصہ دراز سے ایک ہی نام اور ایک ہی سے حدودِ اربعہ کے ساتھ قائم ہو تو اُس نام اور اُن حدود کو ایک گونہ ’’تاریخی تقدس‘‘ (Historical Sanctity) حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اُس کی تقویت کا موجب اور اُس کے استحکام کا سبب بن جاتا ہے، اور اگر کبھی اس پر بحیثیت مجموعی یا اُس کے کسی علاقے پر جزوی طور پر کوئی دوسرا ملک قبضہ کر لیتا ہے تب بھی نہ اُس کا نام بدلتا ہے نہ دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ علاقہ اب اُس ملک کا حصہ نہیں رہا بلکہ قابض ملک کا جزو بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے اُسی وقت سے چین نامی ملک بھی دنیا میں موجود ہے، اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے اور اُس کی حدود بھی ہمیشہ تقریباً یہی رہی ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ جاپان نے چین کے بہت بڑے رقبے پر طویل عرصے تک قبضہ کیے رکھا، لیکن یہ نہیں ہوا کہ وہ علاقہ ’’چین‘‘ نہ رہا ہو بلکہ ’’جاپان‘‘ بن گیا ہو۔ بلکہ چین چین ہی رہا اور جاپان جاپان رہا اور کہنے میں یہی آتا رہا کہ چین کے اتنے رقبے پر جاپان قابض ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاریخی عامل اور یہ تاریخی تقدس پاکستان کو حاصل نہیں ہے اور اِس نام اور اِن حدود کے ساتھ تاریخ انسانی میں کبھی کوئی ملک موجود نہیں رہا۔ بلکہ پاکستان کا تو لفظ آج سے پچاس سال قبل تک دُنیا کی کسی لغت میں موجود ہی نہیں تھا۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اِسی کا مظہر تھا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے پاکستان کے نام کی قیمت ٹکا بھر بھی نہ سمجھی اور مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوتے ہی اس نام کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا۔ ورنہ غور کا مقام ہے کہ کیا اِس وقت دنیا میں دو جرمنی، دو یمن اور دو کوریا موجود نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے نام کو چھوڑنا گوارا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں! یہ اس لیے کہ ان ناموں کی تاریخی حیثیت ہے جس کی بناء پر انہیں ایک شہرت اور نیک نامی (Good Will) حاصل ہے جسے کوئی بھی ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ جب کہ ’’پاکستان‘‘ ایک جدید اور ’’حادث‘‘ نام ہے جس کی کوئی خاص قدر و قیمت ابھی قائم نہیں ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ راقم کے نزدیک اگر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جاتا، لیکن اپنے نام کو برقرار رکھتا تو صدمہ تو اِس صورت میں بھی ہوتا لیکن اکہرا۔ اور جب اُس نے اپنا نام تک بدل ڈالا تو یہ دوہرے صدمے والی بات ہوئی۔ اِس لیے کہ اِس طرح ہمارے بنگالی بھائیوں نے نہ صرف خود اپنی پینسٹھ سالہ تاریخ سے اعلانِ برأت کیا، بلکہ پوری برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی توہین کی جس کی مشترکہ و متحدہ جدوجہد سے پاکستان قائم ہوا تھا! یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اس پورے معاملے میں اصل موردِ الزام ہمارے بنگالی بھائی ہیں یا ہم یا پوری سابقہ ملت اسلامیہ پاکستان!......اسی طرح ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے

کے مصداق یہ بھی لازمی نہیں کہ مشرقی پاکستان کی یہ قلب ماہیت مستقل اور دائمی ہو۔ اِس

ضمن میں بنگلہ دیش کے قیام سے لے کر اب تک بھارت کا جو سلوک اُس کے ساتھ رہا ہے اُس کے ردّعمل کے طور پر الحمدللہ وہاں ''پاکستانیت'' کا احیاء اس حد تک ہو چکا ہے کہ مولوی فرید احمد مرحوم کے صاحبزادے کا یہ بیان سامنے آچکا ہے کہ ہم وہاں آئندہ الیکشن ''مشرقی پاکستان'' کے نام پر لڑیں گے۔

بہرحال یہ رنج اور صدمے والی بات بھی اپنی جگہ اور اسی طرح آئندہ کے امکانات سے بھی قطع نظر، اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اصل اہمیت اِس حقیقت کی ہے کہ پاکستان کی تقویت کے لیے ''تاریخی تقدس'' کی قسم کا کوئی عامل موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا وہ قول بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی، جو حال ہی میں پاکستان کے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے ایک روزنامے کے کالموں میں نقل کیا ہے، یعنی یہ کہ ''پاکستان کے معاملے کو ہندوستان پر قیاس نہ کیا جائے، ہندوستان ایک ''ملک'' ہے اِس کے حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں بہرحال یہ موجود رہے گا، جب کہ پاکستان ایک ''تجربہ'' ہے جو اگر ناکام ہو گیا تو پاکستان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔'' میرے نزدیک اگر یہ روایت درست ہے تو مولانا مرحوم نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جس فرق کی نشاندہی کی ہے وہ اسی ''تاریخی عامل'' پر مبنی ہے۔

2- جغرافیائی عامل

کسی ملک کو تقویت دینے والا دوسرا عامل جغرافیائی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی سرحدیں فطری جغرافیائی حدود (Natural Geographical Boundaries) کی صورت میں ہوں تو اِس سے بھی اُس ملک کو ایک گونہ حفاظت حاصل ہوتی ہے جو اس کی تقویت کی موجب اور اُس کے دفاع میں ممدومعاون ہوتی ہے۔ کلام اقبال کے پہلے اُردو مجموعے کی پہلی نظم کے پہلے شعر میں یہ حقیقت بڑی خوبصورتی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یعنی

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں!

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ موجودہ ساری سائنسی اور تکنیکی ترقی کے باوجود کوہِ ہمالیہ کی حیثیت بھارت کے شمال میں ایک فصیل کی سی ہے۔ اور اگرچہ تقسیم ہند کے بعد ہمالیہ کے انتہائی مشرقی حصے میں چین اور بھارت کے مابین ایک خونریز جھڑپ ہو چکی ہے، جو نتائج کے اعتبار سے بھارت کے لیے نہایت ذلت آمیز اور رُسوا کن ثابت ہوئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کی پوری تاریخ ایسے کسی واقعے سے بالکل خالی ہے اور اب بھی بھارت کو اِس جانب سے اندیشہ بہت کم ہے۔

اسی طرح ۶۵ء کی جنگ کے ضمن میں ہمیں خود یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک وقتی سے جوش اور جذبے کے تحت وجود میں آنے والی بی آر بی کینال بھارت کے بھرپور حملے کے مقابلے میں لاہور کی حفاظت کا ذریعہ بن گئی تھی۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو ۴۷ء میں قائم ہونے والا اصل پاکستان تو واقعتاً تاریخ کا ایک انوکھا تجربہ نظر آتا ہے، اِس لیے کہ وہ ایسے دو خطوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھے اور اُن کے درمیان سمندر نہیں تھا، بلکہ وہ ملک تھا جس کی مستقل حیثیت ''دشمن کے علاقے'' (Hostile Territory) کی تھی۔ اور غریب مشرقی پاکستان تو تین اطراف سے اُس دشمن کے علاقے میں اِس طرح گھرا ہوا تھا کہ کسی جانب بھی کسی فطری وطبعی آڑ (Natural Barrier) کا وجود نہ تھا۔

مشرقی پاکستان کے مسئلے کو علیحدہ رکھتے ہوئے، موجودہ پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ اِسے کسی طبعی اور فطری سرحدوں کا تحفظ کسی درجے میں حاصل ہے بھی تو وہ شمال، جنوب اور مغرب میں ہے۔ یعنی شمال میں وہی کوہِ ہمالیہ اور کوہ قراقرم، جنوب میں سمندر اور مغرب میں کوہِ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ، جہاں تک اس کی طویل ترین مشرقی سرحد کا تعلق ہے، جدھر سے اِسے سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے اُدھر کسی فطری وطبعی سرحد کا نشان تک موجود نہیں، چنانچہ پنجاب کا میدان اِس طرح کاٹا گیا ہے جیسے کیک کاٹا جاتا ہے، اور اگر خاردار تاروں کی کوئی باڑ موجود نہ ہو تو معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ کہاں ایک ملک

ختم ہو گیا اور دوسرا شروع ہو گیا۔ رہا سابق ریاست بہاولپور اور پھر سندھ کے ریگزار اور صحرا کا تعلق تو اُس کے ٹیلے تو خود ہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں، وہ کیا نشان بنیں گے اور کیا حفاظت کریں گے۔ ع

''او خویشتن گم است کرا رہبری کند''

الغرض! جغرافیہ بھی ہمارا پشت پناہ نہیں ہے بلکہ ہمارے خلاف ہے۔

3-انسانی جذبہ

ملکوں کو مستحکم کرنے والے تیسرے عامل کو ''انسانی جذبہ'' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی ملک یا خطہ ارضی کے رہنے والے انسانوں میں کوئی حقیقی اور واقعی جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ تاریخ کو بھی شکست دے سکتا ہے اور جغرافیہ سے بھی لڑ سکتا ہے، اِس لیے کہ انسان واقعتاً اشرف المخلوقات ہے اور قدرت نے اِس میں بے پناہ قوتیں اور توانائیاں ودیعت کر رکھی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب کسی قوم اور بالخصوص اُس کے جوانوں میں کوئی جذبہ حقیقتاً اور واقعتاً پیدا ہو جائے تو اُس کا رخ سوائے مشیت ایزدی اور قدرتِ خداوندی کے دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں پھیر سکتی۔ بقول اقبال ؎

''عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں!''

اب اگر ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسانی جذبے کی دو ہی قسمیں نظر آئیں گی: ایک قوم پرستانہ جذبہ اور دوسرا مذہبی جذبہ۔ ان میں سے بھی اگرچہ تاریخ انسانی کے عظیم ترین معجزے تو مذہبی جذبے ہی کے تحت رونما ہوئے ہیں، تاہم کچھ اِس بناء پر کہ موجودہ دنیا میں یہ جذبہ بالعموم کمزور ہی نہیں معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ اور کچھ موجودہ بحث کی منطقی ترتیب کے تقاضے کے طور پر پہلے ہم ''قوم پرستانہ جذبہ'' کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا اس کی کوئی قسم یا نوع ہمارے پاس بالفعل موجود یا ہمارے لیے ممکن الحصول ہے یا نہیں؟

قوم پرستی کی اقسام

1- نسلی قوم پرستی

قوم پرستی (Nationalism) کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ حیران کن حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام تر علمی و سائنسی ترقی اور ذہنی و فکری ترفع کے باوجود نسل پرستانہ قومیت (Racial Nationalism) کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر ہے۔ عہد حاضر میں اس کی دو نمایاں ترین مثالیں جرمن نیشنلزم اور یہودی نسل پرستی کی صورت میں موجود ہیں۔ جرمن قوم میں اپنے بارے میں ایک اعلیٰ اور برتر نسل (A Superior Race) ہونے کے احساس نے اتنا جذبۂ عمل اور قوتِ مقاومت پیدا کر دی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بیسویں صدی عیسوی کے دوران جرمنی دو بار شدید ترین تباہی سے دو چار ہوا، لیکن دونوں مرتبہ چند ہی سال کے اندر اندر پھر نہ صرف یہ کہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا بلکہ دوسری ہمعصر اقوام اور آس پاس کے ممالک کا ہر اعتبار سے ہمسر ہو گیا بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بازی لے گیا۔ اِسی طرح یہودی قوم میں بنی اسرائیل کے ''خدا کی منتخب اور پسندیدہ قوم'' (Chosen People of the Lord) ہونے کے احساس نے مقاومت اور مدافعت کی اتنی صلاحیت اور اپنی برتری کے بالفعل اظہار (Assertion) کے لیے بے پناہ محنت اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ تاریخ انسانی کے دَوران بارہا انہیں شدید ترین جبر و تشدد (Persecution) کا سامنا کرنا پڑا، اور بعض مواقع پر تو اِن کے ''استیصال'' (Annihilation) اور کلی اور مجموعی خاتمے (Mass Extermination) کی ایسی سرتوڑ کوششیں ہوئیں کہ جن کی کوئی دوسری مثال تاریخ انسانی میں بمشکل ہی مل سکے گی، اِس سب کے باوجود وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ع

''اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے!''

کے مصداق اگر کسی ایک خطے یا ملک سے اُنہیں دیس نکالا مل جاتا ہے تو کچھ ہی عرصے کے بعد نظر آتا ہے کہ انہوں نے کسی اور ملک میں قدم جما لیے ہیں۔ چنانچہ اِس صدی کے آغاز میں علامہ اقبال نے اُن کی جس کیفیت کا مشاہدہ بچشم سر یورپ میں کیا تھا جس کی تعبیر انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ ع

''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!''

اُس کے بعد بالخصوص جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں ان کا جو حشر ہوا اور وقتی طور پر اُنہیں جو نقصان پہنچا اُس کے چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بعینہٖ وہی حیثیت امریکہ میں حاصل کر لی۔ چنانچہ آج اسرائیل کی چھوٹی سی مملکت امریکہ ہی کی امداد اور سرپرستی کے بل پر نہ صرف پورے عالم عرب بلکہ پورے عالم اسلام کو ناک چنے چبوا رہی ہے۔ اور اِسی پر بس نہیں دُور بیٹھے پاکستان تک کو دھمکیاں دے رہی ہے۔

اِس سلسلے میں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے آ جائے تو اچھا ہے کہ یہ بات جو دنیا میں بالعموم کہی جاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے دو ملک مذہب کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل، تو یہ درحقیقت اسرائیل کی نسل پرستی کو چھپانے کا نہایت شاطرانہ انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہوا ہے اور وہ ہے پاکستان۔ اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں نسل پرستی پر ہے اور ''صیہونیت'' (Zionism) —— اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں بلکہ نسل پرستانہ تحریک (Racial Movement) ہے اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ (Racist) ملک ہے۔

بہرحال ہماری اس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم نکتہ یہ ہے کہ نظری طور پر نسل پرستی کی بنیاد پر بھی ایک نہایت طاقتور جذبہ وجود میں آ سکتا ہے۔ لیکن (الحمدللہ کہ) پاکستان میں نسلی قومیت کے لیے کوئی اساس موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ برصغیر پاک و ہند نسلی اعتبار سے غالباً پوری دنیا میں سب سے بڑی کھچڑی (بلکہ حلیم!) کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُسی کا ایک خلاصہ اِس وقت پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دراوڑی لوگ بھی موجود ہیں (جیسے بلوچستان کے براہوی قبائل) اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اِسی طرح منگول بھی ہیں اور سامی النسل بھی، بلوچ بھی ہیں اور افغان بھی، حتیٰ کہ شمالی علاقہ جات میں شین بھی ہیں اور بلتی بھی! الغرض یہاں کسی ایک نسل کے لوگ ایسی غالب اکثریت میں موجود نہیں ہیں کہ نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کے استحکام کی توقع کی جا سکے۔

2-لسانی قوم پرستی

نسلی قوم پرستی کے بعد موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قومی جذبہ —— (Potent Nationalism) ---- لسانی قوم پرستی (Linguistic Nationalism) کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں قابل توجہ ہیں: ایک عرب نیشنلزم اور دوسرے بنگلہ نیشنلزم۔

عرب نیشنلزم جو ماضیٔ قریب میں عالم عرب میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے موجود رہا ہے اصلاً ایک لسانی نیشنلزم ہے۔ اِس لیے کہ اس کی اساس نہ مذہب پر ہے نہ نسل پر، بلکہ صرف اور صرف زبان پر ہے۔ چنانچہ اس کے حلقہ بگوش اور علمبردار صرف مسلمان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ دانشوروں کی سطح پر اس میں زیادہ بھاری پلڑا عیسائیوں کا رہا ہے، حتیٰ کہ یہودی بھی اس میں شریک رہے ہیں۔ پھر اس میں نسل کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے اِس لیے کہ شمالی افریقہ کے باشندوں میں جہاں عرب آبادکاروں کی اولاد شامل ہے، وہاں قدیم قبطی اور بربر نسل کے لوگ بھی موجود ہیں۔ لیکن اِس سب کے باوجود محض زبان کے اشتراک نے اِن سب میں مشترک قومیت کا احساس پیدا کیا اور خواہ اُس کے اساسی فلسفے سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالم عرب نے یورپی استعمار کے خلاف جو جدوجہد کی اور جس کے بل پر اِس استعمار کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا، اُس کی اصل اساس اِسی لسانی قوم پرستانہ جذبہ پر تھی۔

اِسی طرح پاکستان کے دولخت ہونے میں جہاں منفی طور پر اولاً بے مقصدیت

اور بے یقینی کے خلاء اور بعدازاں مارشل لاء کے ردعمل کو دخل حاصل ہے، وہاں مثبت طور پر جو ہتھیار سب سے زیادہ کارگر اور جو وار سب سے بڑھ کر کاری ثابت ہوا وہ بنگلہ نیشنلزم کا تھا جس کی اساس بنگلہ زبان پر قائم کی گئی تھی۔

یاد ہوگا کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران تو چونکہ مقابلہ ہندو قوم اور ہندی زبان سے تھا لہٰذا مسلم قومیت اور اُردو زبان تقریباً لازم وملزوم بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تقریباً مترادف اور ہم معنی ہو گئے تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان اُردو کے مدمقابل کی حیثیت سے سامنے آ گئی تھی۔ اور خود قائداعظم کی زندگی کے دوران اِس مسئلے نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اُنہیں اپنی تمام تر علالت اور نقاہت کے باوجود مشرقی پاکستان کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے نہایت توہین آمیز رویہ محض اس بات پر اختیار کیا تھا کہ انہوں نے خالص علمی انداز میں وہاں یہ فرما دیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل بنگلہ زبان کا رسم الخط (Script) بھی وہی تھا جو عربی، فارسی، اردو، حتیٰ کہ سندھی، بلوچی اور پشتو کا ہے، اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ دوبارہ بنگلہ زبان کا رسم الخط اُردو والا ہی اختیار کر لیا جائے تو لسانی بعد و فصل میں کمی آ جائے گی جس سے قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

بہرحال پاکستان کی زندگی کے پہلے پچیس سالوں[1] کے دوران جہاں ایک جانب بے یقینی اور بے مقصدیت کا خلا مہیب سے مہیب تر ہوتا چلا گیا اور قومی وملی سطح پر ضعف بڑھتا چلا گیا، وہاں مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان، بنگلہ ادب، بنگلہ تہذیب اور بنگلہ ثقافت کے حوالے سے بنگلہ نیشنلزم قدم جماتا چلا گیا۔ اور بالآخر اسی کے منطقی نتیجے کے طور پر ''بنگلہ دیش'' وجود میں آ گیا اور مشرقی پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا۔

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ زبان کا اِشتراک لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان میں یگانگت پیدا کرنے میں نسلی اشتراک سے بھی زیادہ مؤثر اور سریع الاثر ہے۔ اس لیے کہ نسلی اشتراک کا تعلق اصلاً ماضی اور اس کی روایات سے ہوتا ہے، جب کہ لسانی اشتراک فی الفور محسوس ومشہود ہوتا ہے اور اپنی مادری زبان میں انسان اپنے جذبات واحساسات کا اظہار جس بے تکلفی سے اور جس بھرپور انداز میں کر سکتا ہے کسی دوسری زبان کو خواہ وہ کتنا بھی سیکھ لے اور اُس میں کتنی بھی مہارت حاصل کر لے، اُس میں جذبات کے اظہار کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بنابریں اشتراک لسانی اجتماعیات انسانیہ میں ''عصبیت'' پیدا کرنے میں بہت دخیل اور مؤثر ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ باقی ماندہ پاکستان میں وہ واحد زبان جو اِس کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف اور صرف اُردو ہے، تاہم اِس کا عمل دخل اتنا بہرحال نہیں ہے کہ اُسے ایک لسانی قومیت کی بنیاد بنایا جا سکے۔ اور بنگلہ زبان کا مسئلہ ختم ہو جانے کے بعد موجودہ پاکستان میں کم از کم ایک زبان ایسی موجود ہے جو کسی بھی طور سے اُردو کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ہماری مراد سندھی زبان سے ہے، جس کی اساس پر ''سندھی نیشنلزم'' ہو بہو ''بنگلہ نیشنلزم'' کے خطوط پر پروان چڑھ رہا ہے، بلکہ واقعتاً ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے، حتیٰ کہ ''بچے کھچے پاکستان'' کو سب سے بڑا داخلی خطرہ اِسی سے لاحق ہے۔

یہ اسی کا مظہر تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے تقریباً فوراً بعد لسانی فسادات کا لاوا سندھ میں پھٹ پڑا تھا جس سے مغربی پاکستان کی سالمیت کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں اور سقوطِ مشرقی پاکستان پر بھارت کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے جہاں یہ الفاظ کہے تھے کہ ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے۔'' (We Have Avenged One Thousand Years Defeat) جس سے پنڈت موتی لال نہرو ایسے بظاہر وسیع المشرب انسان کی پوتی اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسے مذہبیت سے دُور اور سوشلزم کے پرستار کی بیٹی کی بھی خالص ''ہندوانہ ذہنیت'' کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ وہاں ساتھ ہی اپنی قوم سے وعدہ بھی کیا تھا کہ:

[1] واضح رہے کہ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک شمسی حساب سے تقریباً سوا چوبیس سال بنتے ہیں لیکن قمری حساب سے پچیس سال سے بھی کسی قدر زائد۔

’’میں عنقریب ایک بہت بڑی خوش خبری اور سنانے والی ہوں۔‘‘

جس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی تھی کہ بقیہ پاکستان کی سالمیت بھی ہندو ذہن اور مزاج کے لیے کس درجہ ناقابل برداشت شے ہے۔ اس لیے کہ اُس کے اِس وعدے کا مصداق خارجی ظاہر ہے کہ سندھ کے لسانی فسادات کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں دی جا سکتی۔

قصہ مختصر یہ کہ ہمارے پاس کل پاکستان اساس پر کسی لسانی قومیت سے پیدا شدہ جذبۂ عمل تو درکنار، تا حال ’’قومی زبان‘‘ کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں ہے۔

3-وطنی قومیت

وطن کی اساس پر قومیت کی تشکیل کا تصور زیادہ پرانا نہیں ہے اور اسے عہدِ جدید کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ تاہم اِس وقت عالمی سطح پر کم از کم نظری اور دستوری و قانونی اعتبار سے سب سے زیادہ چرچا اور سب سے بڑھ کر رواج اِسی کا ہے۔

منطقی اعتبار سے یہ بات بڑی وزنی (Sound) نظر آتی ہے کہ اگر کسی ملک کے رہنے والوں میں اپنے وطن سے قلبی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے احساسات و جذبات میں یک رنگی و ہم آہنگی اور فکر و عمل میں اتحاد اور یک جہتی کی بنیاد بن جائے گا اور اُنہیں ایک ’’بنیان مرصوص‘‘ کی صورت عطا کر دے گا، اور اس کے زیر اثر رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت کا فرق و امتیاز جو ملکوں اور قوموں کی کمزوری کا باعث بنتا ہے اگر بالکل ختم نہیں ہوگا تو کم از کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر میں قومیت کے تعین کے ضمن میں وطن ہی کو تقریباً متفقہ طور پر اساس تسلیم کر لیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ اِسی کا مظہر ہے کہ ایک موقع پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ’’آج کل قومیں وطن کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔‘‘ جس پر نہایت سخت اور تیز و تند تنقید کی تھی مفکر و مصور پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے، جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا، تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تا حال ’’وطنی قومیت‘‘ کی جڑیں لوگوں کے احساسات و جذبات میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہیں، اور جذبات کی دنیا میں اصل راج رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت ہی کا ہے، اور بالفعل ’’وطنی قومیت‘‘ صرف ملکی دستور میں شہریت (Citizenship) کی اساس اور پاسپورٹوں پر قومیت (Nationality) کے اندراج کے طور پر کام آتی ہے اور اس نے کسی مؤثر ’’قوم پرستی‘‘ (Nationalism) کی صورت کہیں بھی اختیار نہیں کی۔

اِس کے باوجود چونکہ پاکستان میں کسی قوم پرستانہ جذبہ کی پیدائش اور نشوونما کے لیے نہ اشتراکِ نسل کی بنیاد موجود ہے نہ اشتراکِ زبان کی، لہٰذا اِس کے ضمن میں کم از کم نظری طور پر کسی قوم پرستانہ جذبے کے لیے واحد دستیاب اساس (The Only Available Basis) یہی رہ جاتی ہے۔ اور غالباً اسی درجہ بدرجہ نفی کے عمل (Process of Elimination) کا نتیجہ تھا کہ بانی و مؤسس پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہہ دیا تھا کہ:

> ’’عنقریب پاکستان میں نہ مسلمان مسلمان رہیں گے نہ ہندو ہندو رہیں گے، مذہبی اعتبار سے نہیں، اِس لیے کہ مذہب تو اشخاص کا انفرادی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم کے اعتبار سے۔‘‘

قائداعظم مرحوم کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور آیا ان الفاظ کو اُن کے سابقہ بیانات اور اعلانات کی نفی اور اپنے سابقہ مؤقف سے انحراف کا مظہر قرار دیا جائے، یا اُن کے اعصاب پر اُس وقت کے حالات کی پیچیدگیوں اور سنگینیوں سے پیدا شدہ شدید دباؤ کا اثر سمجھا جائے؟ (جیسا کہ غلام احمد پرویز نے بالفعل کیا ہے) اِس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے اور اگرچہ اس کے ضمن میں راقم الحروف کی ایک سوچی سمجھی رائے ہے، جسے ان شاء اللہ بعد میں بیان بھی کیا جائے گا تاہم موضوع زیر بحث کے اعتبار سے فی الوقت عرض یہ کرنا ہے کہ خواہ کوئی شخص اِس نتیجے پر، کہ پاکستان کے مسائل کا حل ایک وطنی نیشنلزم میں ہے، مجبوراً متذکرہ بالا (Process of Elimination) سے پہنچا ہو

خواہ وہ مثبت طور پر اسی نظریے کا ذہناً وقلباً قائل ہو، حقیقت واقعی یہ ہے کہ ''پاکستانی نیشنلزم'' نام کی کوئی شے نہ تا حال وجود میں آئی ہے نہ تا قیامت آ سکتی ہے۔

پہلی وجہ: دوقومی نظریہ

اس کی اوّلین اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستان دوقومی نظریہ کی اساس پر وجود میں آیا تھا، جو وطنی قومیت کے نظریے کی کامل نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی ملک قائم تو ہو کسی نظریے کی کامل نفی کی اساس پر اور پھر اس کے استحکام کے لیے وہی نظریہ جڑ بنیاد کا کام دے سکے؟

یاد کیجئے! کہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین اختلاف و نزاع کی اصل بنیاد کیا تھی؟ کانگریس کے نزدیک مذہب وملت کا معاملہ علیحدہ تھا اور قومیت کا علیحدہ، چنانچہ ہندوستان میں مذاہب بہت سے تھے لیکن اُن سب کے پیرووٴں پر مشتمل قوم ایک ہی تھی یعنی انڈین نیشن یا ہندی قوم، جب کہ مسلم لیگ کا مؤقف یہ تھا کہ یہ صورت دوسرے جملہ مذاہب کے پیرووٴں کے نزدیک قابل قبول ہو تو ہو کم از کم مسلمانانِ ہند کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہے، اس لیے کہ اُن کی قومیت کی اساس مذہب پر ہے، لہٰذا وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اور اپنے جداگانہ قومی تشخص کے بقاء کی ضمانت کے طور پر علیحدہ ملک کے حق دار ہیں۔

اِس موضوع پر خود قائداعظم محمد علی جناح کے بے شمار بیانات اور اعلانات مشہور ومعروف ہیں، جن کا دوہرانا محض تحصیل حاصل کا مصداق اور وقت اور قلم وقرطاس کے لاحاصل صرف کا باعث ہوگا۔ البتہ اصولی اور اساسی اعتبار سے ''وطنی قومیت'' کے نظریے پر جو کاری ضرب مفکر ومصور پاکستان علامہ محمد اقبال نے لگائی تھی وہ یقیناً اِس قابل ہے کہ اُسے ذہنوں میں تازہ کیا جائے۔ اِس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے صرف تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی شواہد ہی پیش نہیں کیے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ضرب ابراہیمی سے اِس باطل نظریے کے بت ہی کو پاش پاش کر دیا تھا کہ ملکی سرحدیں مستقل قومیتوں کی تشکیل کی بنیاد بن سکتی ہیں اور انسان محض زمینی تعلق کی بناء پر ایک دوسرے سے کٹ سکتا ہے۔ چنانچہ ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) کے عنوان سے فرماتے ہیں ۔

''اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دِکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اِس بت کو ملا دے!''

ذرا الفاظ کی گہرائی میں اُتر کر مفکر ومصورِ پاکستان کے اس موضوع پر احساس کی شدت کا اندازہ لگایا جائے تو بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ ۔

''عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا!''

اِسی طرح مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے متذکرہ بالا جملے پر جو تلخ اور تیز وتند لیکن شعریت اور فصاحت و بلاغت کی معراج کے مظہر اشعار کہے تھے علامہ سر محمد اقبال نے، وہ یہ تھے: ۔

''عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ

زِ دیوبند حسین احمد! ایں چہ بو العجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است!''

یہ دوسری بات ہے کہ جب مولانا مدنیؒ نے یہ وضاحت فرمائی کہ اوّلاً انہوں نے لفظ قوم کا استعمال کیا تھا ملت کا نہیں! اور ثانیاً: انہوں نے صرف موجودہ دور کی عام روش کا ذکر کیا تھا، نہ اُس کی وکالت کی تھی، نہ ہی مسلمانوں کو اِس کے قبول کرنے کی تلقین کی تھی، تو علامہ مرحوم نے فوراً اعتراف کیا کہ اس پر اعتراض کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اپنے اشعار سے بھی رجوع کر لیا۔ اگرچہ اُن کے کلام کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ اشعار اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔ (کاش کہ ان کے اشعار کے ساتھ کلام اقبال کے طابع و ناشر متذکرہ بالا حقائق پر مشتمل ایک وضاحتی نوٹ بھی شائع کر دیا کریں)۔

قصہ مختصر، وطنی قومیت کا نظریہ تحریک پاکستان کی نفی ہے اور اس کے فروغ سے پاکستان کی جڑیں مزید کھوکھلی تو ہو سکتی ہیں مضبوط نہیں ہو سکتیں۔

دوسری وجہ مسلمانوں کی طبعی ساخت

دوسری نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ باعمل (Practicing) ہو، خواہ بے عمل (Non-Practicing) ——— بہر حال اُس کے مزاج کی ایک مستقل ساخت ہے اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص اُفتاد ہے، جس میں زمین کی پرستش اور ''وطن'' کے تقدس کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گویا اُس کی شخصیت کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے اُس میں ''حبِ وطن'' کا مادہ تو ہو سکتا ہے، ''وطن پرستی'' کا امکان نہیں ہے۔ پروفیسر مرزا محمد منور اِس حقیقت کو اِن خوبصورت الفاظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں کہ ہندو کلچر زمین میں گڑا ہوا اور زمین سے بندھا ہوا (Earth Rooted and Earth Bound) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں زمین ''دھرتی ماتا'' کی حیثیت رکھتی ہے اور ''بھارت کی جے'' کے نعرے سے اُن کے جذبات میں اُبھار اور احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے، جب کہ مسلمان کے دل میں زمین کے مقدس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اُس کا مزاج ''آفاقی'' ہے اور اُس کے جذبات میں گرمی اور احساسات میں ہلچل ''اللہ اکبر'' کے نعرے سے ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی اُس نظم میں جس کے چند اشعار اُوپر نقل ہو چکے ہیں، اِس ''قیدِ زمینی'' کے تصور پر بھی نہایت زوردار تیشہ چلایا ہے: ؎

''ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنت محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے!''

برصغیر کے مسلمانوں کی خصوصیت

اس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو زیادہ ہی خصوصیت حاصل ہے اور ان کا مزاج کچھ زیادہ ہی ''آفاقی'' ہے۔ اِس کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہاں کوئی دوسری نسلی یا لسانی عصبیت ایسی موجود نہیں تھی جو اُنہیں ایک دوسرے سے باندھ سکتی، لہٰذا اپنی شیرازہ بندی کے لیے انہیں مذہب کی قوت ماسکہ (Binding Force) پر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی انحصار کرنا پڑا اور چونکہ اسلام ایک علاقائی مذہب نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے۔ لہٰذا اُن میں ''آفاقیت'' دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سرایت کر گئی اور ؏

''ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!''

اُن کے قلوب واذہان میں خوب رچ بس گیا اور اُن کے قومی شعور کا جزو لاینفک بن گیا۔

چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی استعمار کے ہاتھوں عالمی ملت اسلامیہ کو جو چرکے لگے اور صدمے سہنے پڑے اور جن مظالم کا نشانہ بننا پڑا، اُن پر سب سے زیادہ دردانگیز نالے اور رقت آمیز مرثیے ہندوستان کے مسلمانوں نے کہے۔ اور اگرچہ وہ خود تو اُن مظالم و مصائب سے گزشتہ صدی کے دوران دوچار ہو چکے تھے اور اب نسبتاً پُرامن ماحول اور قانونی و دستوری نظام میں زندگی گزار رہے تھے، لیکن جب بھی دنیا کے کسی بھی کونے سے مسلمانوں پر ظلم وستم کی خبر آتی تھی، ہندوستان کا مسلمان بالکل اسی شان کے ساتھ تڑپ اُٹھتا تھا جس کا نقشہ اِس شعر میں سامنے آتا ہے:۔

”خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!“

چنانچہ طرابلس میں مسلمانوں کے جھنڈے سرنگوں ہوئے تو عربی زبان میں دردانگیز مرثیہ کہا اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک اصلاً ہندی اور نسلاً راجپوت مسلمان عالم و عارف کتابِ الٰہی مولانا حمید الدینؒ نے ۔

﴿كَيْفَ الْقَرَارُ وَقَدْ نُكِسْ　　أَعْلَامُنَا بِطَرَابُلُسْ!!﴾

”قرار کیسے نصیب ہو جب کہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں سرنگوں
کر دیئے گئے۔“

اور اسی طرح کے کتنے ہی درد بھرے مرثیے لکھے اُن کے بزرگ اور رشتے کے بھائی علامہ شبلی نعمانیؒ نے (علامہ شبلی اور مولانا فراہی آپس میں ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے)۔ پھر پوری اُمت مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روئے مولانا حالیؔ، جنھوں نے اُمت کے درد اور اصلاحِ احوال کی بے پناہ آرزو کے تحت اپنی شہرہ آفاق ”مسدس“ لکھ ڈالی۔ جس کے سرنامے کے یہ دو اشعار تو ابدی اور غیر فانی ہیں کہ ۔

”پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!“

اور اسی طرح آخر میں ”مناجات بحضور سرورِ کونینؐ“ کے یہ دو اشعار بھی نہایت دردانگیز اور رقت آمیز ہیں:

”اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!“

پھر ذرا تصور کیجئے اُن جرأت مندانہ اور ولولہ انگیز مضامین و مقالات کا جو پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکوں کی حمایت میں نکلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سحر آفریں اور جذبہ پرور قلم سے، اور شائع ہوئے ”الہلال“ اور ”البلاغ“ میں (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء)—— پھر کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی عظمت وسطوت گزشتہ کے ضمن میں اِس صدی کا سب سے بڑا نوحہ خواں، امت مسلمہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچنے والے دُکھ اور درد پر سب سے بڑھ کر دردانگیز نالے بلند کرنے والا اور آہ و فغاں کرنے والا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین وملت کی نشاۃِ ثانیہ کے ضمن میں سب سے بڑا حُدی خواں بھی، اسی صنم خانۂ ہند سے تعلق رکھنے والا ”برہمن زادہ“ اور ”کافر ہندی“ تھا۔ بقول خود اُس کے:۔

”کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
لب پہ صلوٰۃ و درود دل میں صلوٰۃ و درود“

اور ع　”برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است!“

چنانچہ وہ کبھی جزیرۂ صقلیہ کو دیکھ کر خون کے آنسو رویا:۔

”رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی

بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
غلغلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے!''

کبھی ہسپانیہ سے مخاطب ہوکر نوحہ کناں ہوا۔

''ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دَب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اُس کے شرر میں!''

کبھی مسجد قرطبہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے باطنی سوز وگداز اور ذوق وشوق کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کا کشود
کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اُندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن کی تیرے نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!
دیدۂ انجم میں ہے تری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!''

اور ساتھ ہی ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی نوید جانفزا دیتا دکھائی دیتا ہے۔

آبِ رواں کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات، کشمکش انقلاب!''

اور کبھی طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ بنت عبداللہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذبات ملی کا اظہار کرتا ہے:۔

''فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیان دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے

ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اِس آغوش میں!''

تو کبھی ترکوں کے رنج والم میں شریک ہوکر اور اُن کے مصائب پر اپنے کرب کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خوشخبری بھی سناتا ہے: ؎

''دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!''

اور اس کے لیے مسلمانوں کو جو پیغام عمل دیتا ہے اُس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ؎

''تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا!''

الغرض مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کا مزاج ویسے تو ابتداء ہی سے آفاقی رہا ہے، لیکن اِس صدی میں تو یہ کیفیت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اِس مزاج اور اُفتادِ طبع اور اس اندازِ فکر ونظر کے وارثِ کامل اور حاملِ اتم مسلمانانِ پاکستان کے قلب ونظر کی ایسی قلب ماہیت کیسے ممکن ہے کہ زمینی تعلق اتنا مضبوط اور وطن کی پرستش اتنی گہری ہو جائے کہ ایک وطنی نیشنلزم (Territorial Nationalism) اس کے استحکام کی اصل اساس بن جائے۔

اِس ضمن میں اِس تاریخی عجوبے پر بھی نگاہ رہے تو مناسب ہوگا کہ اِس صدی کے اوائل میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر ایک زبردست عوامی تحریک چلی صرف اور صرف ہندوستان میں۔ اور اس تحریک کی تیزی اور تندی کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ پورے برصغیر کی فضا اِس شعر کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھی تھی کہ ؎

''بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!''

بلکہ ہندوؤں تک کو اِس تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اِس لیے کہ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے شدت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اِس وقت اِس تحریک کا ساتھ نہ دیا تو پورا پولیٹیکل کیریئر ختم ہوکر رہ جائے گا۔

تیسرا سبب: تقسیم در تقسیم کا اندیشہ

اِس ضمن میں تیسری اور آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ اگر زمینی تعلق ہی کو قومی جذبہ کی بنیاد بنانے پر زور دیا جائے تو اِس سے اتحاد نہیں، انتشار وجود میں آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ نظریہ ایک ایسے حیوان کے مانند ہے جو اپنے دشمن کو خود اپنے ہی دودھ سے پالتا ہے۔ چنانچہ ''وطنی قومیت'' ہی کے بطن سے ''علاقائی قومیتیں'' جنم لیتی ہیں اور اُسی کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھتی ہیں۔

اِس ضمن میں بھارت کا معاملہ اگرچہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے کہ لفظ بھارت بھی کئی ہزار سال پرانا ہے اور ''مہا بھارت'' کا تصور بھی نہایت قدیم ہے۔ جب کہ، جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، پاکستان کا تو نام ہی حادثِ محض ہے، اِس کے باوجود ''وطنی قومیت'' کے نظریے میں تقسیم در تقسیم کے جو بیج بالقوہ (Potentially) موجود ہوتے ہیں، اُس کا نقشہ وہاں بھی نظر آ رہا ہے اور علاقائی قومیتیں اور مقامی عصبیتیں نسلی اور لسانی عوامل سے مزید تقویت پا کر نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ سر اٹھا رہی ہیں اور بھارتی قیادت کو اپنی ملکی وحدت و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم و مسلسل اور شدید و جاں گسل محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کا معاملہ بے حد نازک اور کمزور ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کا تو تصور بھی پچاس سال سے زیادہ کی تاریخ نہیں رکھتا، اور کم از کم اِس نام کے ساتھ کسی سیاسی وحدت اور اُس کی عظمت و سطوت کی کوئی تاریخ موجود نہیں، لہٰذا اگر اِس کی اساس پر وطنی قومیت کا راگ الاپا گیا تو اصل تقویت سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی قومیتوں کو حاصل ہوگی۔ اِس لیے کہ اگر فی الواقع زمینی رشتہ ہی مقدس ہے تو ایک سندھی کے لیے سندھ کے وطن ہونے کا تصور زیادہ قریبی بھی ہے اور قدیمی بھی۔ پھر اِس کو تقویت دینے کے لیے خاص طور پر لسانی عامل موجود ہے جو نہایت قوت کا حامل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان کا لفظ بھی نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، اور اِس کی حدود بھی ہرگز نہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں نہ اُن پر مبنی، تو پھر اگر وطن ہی کو ''پوجنا'' ہے تو سرزمین سندھ کو کیوں نہ ''پوجا'' جائے۔ وَقِسْ عَلٰی ذالِكَ۔

''وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟''

اِس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے نہ ''تاریخی تقدس'' کا عامل موجود ہے نہ ہی ''جغرافیائی عوامل'' اس کے پشت پناہ ہیں، پھر کوئی نسلی، لسانی یا وطنی قومیت کا جذبہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اِس کے استحکام کے لیے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکے ـــــ لہٰذا اِس کے استحکام کا کل دارومدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے جس نے اِسے جنم دیا تھا ـــــ یعنی ''مذہبی جذبہ''۔ گویا پاکستان کا معاملہ بالکل ع ''کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو!'' والا ہے کہ اگر اِسے اپنی بقا مطلوب ہے اور یہ کسی دوسری طاقت کا طفیلی یا زیر دست بن کر نہیں، بلکہ باوقار اور باعزت اور حقیقتاً آزاد اور خود مختار ہو کر باقی رہنا چاہتا ہے تو اِس کے لیے کوئی اور چارۂ کار سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے اِس کے کہ یہ اِسلام کا دامن تھامے اور اُسی کا سہارا لے۔''

یہ بات ہر اُس شخص کے لیے اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جو کسی بھی وجہ سے پاکستان کے بقاء و استحکام کا طالب اور خواہش مند ہو۔ اس لیے کہ اگر کوئی بدبخت کسی سبب سے اپنے ذہن و قلب سے پاکستان کو بالفعل ''محو'' (Write-Off) ـــــ کر ہی چکا ہو تو بات دوسری ہے، اُس کے لیے تو ہماری یہ پوری بحث ہی غیر متعلق بھی ہے اور لایعنی بھی۔ لیکن جو شخص بھی دل سے پاکستان کا بقاء و استحکام چاہتا ہو اُس کے لیے ان شاء اللہ العزیز ہمارا یہ تجزیہ فیصلہ کن ثابت ہوگا اور وہ اس حقیقت کو جان لے گا کہ اگرچہ عوام کی فلاح و بہبود، انتظامی مشینری کی اصلاح و تطہیر اور مختلف علاقوں کے رہنے والوں اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا اعتماد و اطمینان بھی نہایت اہم اُمور ہیں اور اُن کے بغیر بھی یقیناً پاکستان مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اور خاص طور پر موجودہ حالت میں تو اِن کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے، اور ان اُمورِ ثلاثہ کے ضمن میں جو شدید کوتاہی مسلسل ہو رہی ہے اگر جلد از جلد اُس کی تلافی کی صورت پیدا نہ ہوئی تو شدید اندیشہ ہے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!'' کا مصداق بن جائے۔ تاہم پاکستان کے دوام و استحکام کی اصل اساس یہ چیزیں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی جذبہ ہے اور اگر وہ جلد از جلد بھرپور انداز میں بروئے کار نہ آیا تو باقی تمام چیزوں کی

اصلاح کے باوجود پاکستان یا تو اپنی سالمیت ہی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اِس کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ یا اگر باقی رہے گا بھی تو کسی دوسری بڑی طاقت کا طفیلی یا زیردست ہو کر۔

اب اِس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں اور تفصیل کے ساتھ عرض کریں کہ وہ مذہبی جذبۂ جو اَب پاکستان کے استحکام کی حقیقی، واقعی، مضبوط اور پائیدار بنیاد بن سکتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً مختلف ہے، اُس ''مذہبی جذبے'' سے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا اور جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل تحریک پاکستان کی رُوح رواں بنا تھا۔ راقم قائداعظم مرحوم کے ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کے جملے کے بارے میں اپنی توجیہہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

راقم کے نزدیک قائداعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ مؤقف سے انحراف کا مظہر تھا۔ اِس لیے کہ قائداعظم مرحوم خواہ ایک ''مذہبی شخصیت'' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاستدانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے، اور اُن کے کردار کی مضبوطی، ''سیرت کی پختگی''، ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں۔ اسی طرح اُن کا وہ متنازعہ جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متاثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا، اِس لیے کہ قائداعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے، بلکہ وہ واقعتاً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور برے سے برے حالات میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

راقم کے نزدیک اُن کے اِس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق مؤقف کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیش نظر اوّلاً برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب، تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی، جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہوگئی اور اِن چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویّے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِّ باب ہو گیا ثانیاً پاکستان میں واقعتاً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیش نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں، واقعتاً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتاً اور واقعتاً اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا، اور اُن کے اجتماعی ارادے'' (Collective Will) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی، لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دارومدار کثرت رائے پر ہوتا ہے، لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتاً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائداعظم کی اس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اِس طریق کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانون اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے، لیکن اِس توجیہہ سے وہ سارے اِشکال حل ہو جاتے ہیں جو اِس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا۔ هٰذَا مَا عِنْدِي وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللهِ!